درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۸)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

© rasailojaraid.c

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝ یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝﴾ (آیات ۱۰ تا ۱۲) ...... صدق اللہ العظیم

پچھلی نشست میں ہم سورۃ الحدید کی آیت ۱۰ پر گفتگو کر رہے تھے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے درانحالیکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لئے ہے''۔ دیکھئے' جس چیز کو ہم مال کہہ رہے ہیں حضور ﷺ نے مختلف احادیث مبارکہ میں اس کی حقیقت کھول کر بیان کر دی کہ مال کیا ہے؟ خرچ کیا ہے اور بچت کیا ہے؟ نفع کیا ہے اور نقصان کیا ہے؟ ''التغابن'' جو کہ ایک سورۃ کا نام ہے اس

© rasailojaraid.c

کا مطلب ہی نفع ونقصان اور ہار جیت کا فیصلہ ہے۔ سورۃ التغابن میں فرمایا گیا ہے:
﴿ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ کہ وہ ہوگا نفع ونقصان اور ہار جیت کے فیصلے کا دن! جو قیامت کے دن جیتا وہ حقیقت میں جیتا اور جو اُس دن ہارا وہ درحقیقت ہارا۔ جو اُس دن کامیاب قرار پایا وہ اصل میں کامیاب ہے اور جو اُس دن ناکام قرار پایا وہ دراصل ناکام ہے۔

اس بارے میں ایک حدیث کا تذکرہ اس سے قبل ہمارے ان دروس میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک بکری ذبح ہوئی' اس کا سارا گوشت اصحابِ صفہ میں تقسیم کر دیا گیا سوائے ایک شانے کے جو حضور ﷺ کے لیے رکھ لیا گیا' کیونکہ اس کا گوشت حضور ﷺ کو بہت مرغوب تھا۔ تو جب حضور ﷺ تشریف لائے اور پوچھا: ((مَا بَقِیَ مِنْھَا؟)) ''بکری میں سے کیا بچا ہے؟'' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: مَا بَقِیَ مِنْھَا اِلَّا کَتِفُھَا ''اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک شانے کے''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ((بَقِیَ کُلُّھَا غَیْرَ کَتِفِھَا)) (ترمذی' صفة القیامة والرقائق) ''بکری کا سارا گوشت (جو فی سبیل اللہ تقسیم کر دیا گیا ہے) بچ گیا ہے سوائے اس شانے کے'' کہ یہ ہم کھالیں گے تو یہ استعمال ہو کر ختم ہو جائے گا۔ یہی بات حضور ﷺ نے اس طرح فرمائی کہ تم کہتے ہو میرا مال' میرا مال' میرا مال! تمہارا مال وہ ہے جو تم نے کھا لیا' یعنی وہ تمہارے وجود کا حصہ بنا' اس سے تمہاری ضرورت پوری ہو گئی تو واقعتاً وہ تمہارا تھا۔ اس کے علاوہ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے پہنا اور اسے بوسیدہ کر دیا' پرانا کر دیا۔ یعنی جو چیز تمہاری ضرورت کی تھی وہ تم نے استعمال کی اور ختم کر دی۔ باقی تمہارا مال صرف وہ ہے جو تم اپنی زندگی میں اپنے ہاتھوں آگے بھیج دیتے ہو۔ اس کے علاوہ باقی سب مال وارثوں کا ہے!

سکندر اعظم کے بارے میں ایک کہانی سی بیان ہوتی ہے کہ اس نے یہ وصیت کی تھی کہ جب میرا جنازہ نکلے تو میرے دونوں ہاتھ کفن سے باہر نکلے ہوں' تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ اس کی فتوحات کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا' لیکن جب اس دنیا سے

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

رخصت ہوا ہے تو اپنے دونوں ہاتھ خالی لے کر گیا ہے‘ کیونکہ مال سارے کا سارا اس دنیا میں ہی رہ جاتا ہے اور پھر وارثوں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ بالآخر یہ سب کچھ اللہ ہی کی ملکیت ہے‘ اللہ ہی کے لئے رہ جاتا ہے۔

داخلی و خارجی حالات کے اعتبار سے درجات میں فرق و تفاوت

آگے فرمایا: ﴿لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ”تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا (اور جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا) وہ برابر نہیں ہیں“۔ آیت کریمہ کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ ہر عمل کی ایک ظاہری شکل اور کمیت ہوتی ہے اور ایک اس کی باطنی کیفیت ہوتی ہے کہ کن حالات میں وہ عمل کیا گیا ہے۔ ان دونوں اعتبارات سے عمل کے اجر و ثواب میں اور اللہ کے ہاں درجے کے تعین میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ دیکھئے ایک انفاق اور قتال فتح سے پہلے ہوا ہے۔ اور یہاں اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ کم سے کم صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ میں حیران ہوا ہوں کہ دورِ حاضر کے بعض مفسرین نے اس سورۂ مبارکہ کے زمانہ نزول کے طور پر غزوۂ اُحد اور صلح حدیبیہ کے مابین کا کوئی زمانہ معین کیا ہے‘ حالانکہ اس آیہ مبارکہ کے متذکرہ بالا الفاظ معین کر رہے ہیں کہ یہ سورۂ مبارکہ فتح کے بعد نازل ہوئی ہے۔ فتح کا اطلاق ظاہری اعتبار سے تو فتح مکہ پر زیادہ ہوتا ہے‘ لیکن قرآن مجید نے چونکہ صلح حدیبیہ کو بھی ”فتح مبین“ کہا ہے لہٰذا صلح حدیبیہ سے قبل تو اس سورۂ مبارکہ کے نزول کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بہرحال فتح سے قبل اور بعد کی صورت حال میں بنیادی طور پر بہت زیادہ فرق ہے۔ اس بات کی وضاحت حضور ﷺ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ غَرِیْبًا فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) (مسلم‘ کتاب الایمان) ”اسلام کا آغاز ہوا تو وہ غریب تھا‘ اور عنقریب یہ دوبارہ اسی غربت کی حالت کو لوٹ جائے گا جیسے یہ شروع ہوا تھا‘ پس خوشخبری ہے ایسے اجنبیوں کے لئے“۔ غریب سے مراد قلاش اور مفلس نہیں ہے‘ بلکہ غریب عربی میں ایسی شے کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی نہ ہو‘ جس کا

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کوئی مونس و ہمدرد اور غمخوار نہ ہو۔ ہم عام طور پر کسی اجنبی کے لئے غریب الوطن کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک شخص اپنے وطن میں ہے تو لوگ اسے جانتے اور پہچانتے ہیں' اس کا وہاں اعتماد ہے' اس کے وہاں دوست اور رشتے دار ہیں' لیکن ایک شخص اگر اکیلا کہیں باہر چلا گیا ہے تو اب وہاں کوئی اس کا جاننے پہچاننے والا نہیں' کوئی ہمدرد نہیں' کوئی مونس و غمخوار نہیں۔ گویا یہ شخص غریب الوطن ہے۔ اسی طرح اسلام بھی ابتدا میں غریب اور اجنبی تھا۔ اس کے بعد اسلام پر ایک دور آیا کہ اللہ نے اس کو قوت اور غلبہ دیا۔ اب ظاہر بات ہے کہ جس شے کو غلبہ حاصل ہو اس کے جاننے پہچاننے والے' اس کے ہمدرد و غمخوار تو سبھی ہو جائیں گے' تو بہت سے لوگ اس کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ حضور ﷺ نے یہ خبر دی تھی کہ عنقریب یہ دوبارہ اسی حالتِ غربت کو لوٹ جائے گا جیسے کہ یہ شروع ہوا تھا۔

© rasailojaraid.com

اس بات کو نوٹ کیجئے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور اقتدار اگرچہ بہت عرصے تک چلا ہے' لیکن اسلام تو بہت جلد غریب ہو گیا۔ یہ وہی دور ہے جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے علم کے دو برتن حاصل کئے تھے' ان میں سے ایک سے تو میں نے خوب علم بانٹا ہے' اسے خوب پھیلایا اور عام کیا ہے' لیکن اگر دوسرے کا منہ بھی کھول دوں گا تو میری گردن اڑا دی جائے گی۔ (صحیح بخاری) تو واقعہ یہ ہے کہ اسلام بہت جلد غریب ہو گیا تھا البتہ مسلمانوں کا غلبہ' ان کی سطوت اور شان و شوکت بہت عرصے تک چلی ہے۔ پھر عربوں کا یہ دورِ عروج ختم ہوا تو دو تین صدیوں پر محیط ایک ایسا دَور آیا جو اُمتِ مسلمہ کے لئے بہت ہی زوال کا دور تھا۔ اس کے بعد پھر سے ترکوں کے ذریعے مسلمانوں کو ایک عظمت اور سطوت ملی' لیکن اسلام پھر بھی غریب کا غریب رہا۔ مغلِ اعظم کا دَور تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے لئے سب سے بڑی غربت کا دور تھا۔ اگرچہ برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی حکومت نصف النہار پر تھی لیکن اسلام تو درحقیقت بالکل زیریں سطح پر پہنچ چکا تھا' بلکہ اندیشہ ہو گیا تھا کہ اس برعظیم سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہاں پر ''دینِ الٰہی'' کے نام سے ایک نیا دین

© rasailojaraid.com

وجود میں آ چکا تھا۔

بہرحال یہ نوٹ کیجئے کہ جب اسلام حالت غربت میں ہوگا تو انفاق اور قتال کا درجہ اللہ کی نگاہ میں بہت بلند ہوگا' جبکہ وہی کام یعنی انفاق اور قتال اگر اسلام کے غلبے کے دور میں ہوگا تو اس کے مقابلے میں درجہ بہت کم رہ جائے گا' اگرچہ حسن نیت اگر ہے تو بہرحال سب کے لئے اللہ کا اچھا وعدہ ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ ''اللہ تعالیٰ نے سب سے بہت عمدہ وعدہ کیا ہے''۔ حسنیٰ' احسن کا مونث ہے' یعنی اللہ کا سب اہل ایمان سے بہت عمدہ وعدہ ہے' لیکن جو لوگ بعد میں قتال اور انفاق کرنے والے ہیں ان کا وہ درجہ کبھی نہیں ہو سکتا جو وہ لوگ لے گئے جنہوں نے یہ کام فتح سے پہلے کیے۔ بقول شاعر۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

اب اجر و ثواب اور درجات کے تعین میں جو دوسرا عنصر ہے' یعنی عمل کی باطنی کیفیت' اس کو ذہن میں رکھئے! جس طرح خارجی حالات کے اعتبار سے ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں' جیسے ایک عمل اسلام کی غربت اور مغلوبیت کے دور میں ہے اور ایک اسلام کے غلبے اور اس کی قوت و سطوت کے دور میں ہے' اسی طرح داخلی اعتبار سے بھی ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں جن کے اعتبار سے عمل کی قدر و قیمت بڑھتی یا گھٹتی ہے۔

ایک ہے حسنِ نیت' جس کا معاملہ اکثر و بیشتر مشکوک رہتا ہے۔ ایک انسان تو وہ ہے جو شعوری طور پر ریا کاری کر رہا ہے۔ یہ شعوری ریا کاری تو شرک ہے اور ایک ایسی چیز ہے کہ جیسے کوئی بڑی سے بڑی رقم صفر سے ضرب کھا کر صفر ہو جائے۔ بلکہ اس سے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جیسے فرمانِ نبویؐ ہے: ((مَنْ صَلّٰی یُرَاءِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَاءِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَاءِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (رواہ احمد) ''جس نے دکھاوے کے لئے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لئے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ کیا وہ شرک کر

© rasailojaraid.co

چکا''۔ لیکن یہ تو شعوری ریا کاری ہوئی' جبکہ ایک ہے تحت الشعور میں ریا کاری کا عنصر۔ جیسے سورۃ التغابن میں اللہ تعالیٰ کے علم کی third dimension ان الفاظِ مبارکہ میں لائی گئی ہے: ﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ کہ اللہ تو سینوں کی پوشیدہ باتوں سے بھی واقف ہے۔ بسا اوقات انسان کو خود اندازہ نہیں ہو پاتا کہ کس طرح غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر اس کی نیت کے اندر کہیں کسی درجے میں سُمعہ اور ریا کا حصہ شامل ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یقیناً عمل کے اجر و ثواب اور اس کے مرتبے کے اندر کمی آ جائے گی' لیکن اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے' یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں ہے۔

اس کے علاوہ ایک داخلی پہلو اور بھی ہے۔ اللہ نے تمام انسان ایک جیسے پیدا نہیں کیے' مختلف لوگوں کی جبلتیں مختلف ہیں۔ اس کو سورۂ بنی اسرائیل میں یوں بیان کیا: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ ''کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) کہ ہر شخص اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے''۔ شاکلہ کہتے ہیں شکل دینے والی شے کو' جسے عام طور پر سانچہ (mould) کہا جاتا ہے۔ آپ لوہا یا کوئی اور دھات پگھلا کر کسی سانچے میں ڈال دیں تو اس کی شکل اس سانچے کے مطابق ہو جائے گی۔ تو یہ سانچہ جو ہے یہ شاکلہ ہے۔ ہر انسان کا ایک جداگانہ شاکلہ ہے۔ آج کے دور میں یہ بات جینز یا جینیٹکس کے حوالے سے بہت معلوم و معروف ہے۔ ہمیں نا معلوم کہاں کہاں سے جینز ملے ہیں! نا معلوم کتنی پشتوں سے یہ جینز چلے آ رہے ہیں جو ہماری شخصیت کو ایک شکل دیتے ہیں۔ ہر شخص کا جو جینیٹک structure ہے اور جو اُس کی شخصیت کا شاکلہ ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔ فرض کیجیے کسی شخص کے اندر اپنے شاکلہ کے اعتبار سے شہوت کا زیادہ زور ہے ہی نہیں' اب اگر ایسا شخص پاک دامن ہے تو اس نے کوئی بڑا تیر نہیں مارا۔ لیکن اگر کسی شخص کے اندر شہوت کا زور ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہے اور پاک دامن ہے تو یہاں اب دونوں کے اجر و ثواب اور درجے میں فرق واقع ہو جائے گا۔ پاک دامنی دونوں کی برابر ہے' لیکن کس شخص نے کس حالت میں اپنے آپ کو کنٹرول کیا ہے' اس اعتبار سے فرق واقع ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص طبعاً بزدل

© rasailojaraid.com

ہے' اس کے اندر جرأت اور شجاعت نہیں ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے تو اس کا مقام و مرتبہ اس شخص سے بہت بلند ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی طبعاً جرأت مند بنایا ہے اور اس کے اندر سے خوف نکالا ہوا ہے اور وہ بھی اسی شخص کے مانند اللہ کی راہ میں آگے بڑھ رہا ہے۔ تو یہ ساری چیزیں ہیں کہ جن سے کسی کے عمل کی قدر و قیمت اور اس عمل کرنے والے کا درجہ متعین ہوتا ہے۔

اسی لئے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ ''اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو تم عمل کرتے ہو''۔ میں یہ بات پہلے نوٹ کرا چکا ہوں کہ اس سورۃ میں بھی اور سورۃ التغابن میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ''بصیر'' کا ذکر پہلے ہوا ہے اس کی صفت ''خبیر'' کے ذکر سے۔ اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۴ میں ہے: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اس کو جو تم کرتے ہو''۔ سورۃ التغابن میں بھی یہی ترتیب ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت 'خبیر' میں بہت گہرائی ہے کہ وہ ہر شے سے خوب باخبر ہے۔ ہماری زبان میں بصارت کا لفظ عام طور پر ظاہری بصارت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر کسی بھی عمل کے ظاہر سے ہوتا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفت خبیر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کس نے کیا عمل کس حالت میں کیا ہے' اس نے اس کام کی انجام دہی کے لئے اپنی کتنی اندرونی رکاوٹوں کے اوپر غلبہ حاصل کیا ہے اور اسے اس کے لئے کتنی جدوجہد کرنا پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے کہ کس شخص کے لئے یہ کام کتنا آسان ہے۔ لہٰذا حالاتِ خارجی اور حالاتِ داخلی (پھر داخلی حالات میں بھی نیت اور شاکلہ دونوں شامل ہیں) ان سب کے اعتبارات سے کسی بھی عمل کی قدر و قیمت کا تعین ہوگا۔ ہمارے بڑے سے بڑے کمپیوٹر کے لئے بھی یہ قطعاً ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام حقائق کو پیش نظر رکھ کر کوئی معاملہ طے کر سکے۔ لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو صرف اللہ اس سے باخبر ہے۔ تمہارے ان اعمال کا ہر پہلو اس کے سامنے واضح ہے۔ ہر شخص کا درجہ اللہ تعالیٰ کے علم قطعی کے اعتبار سے معین ہوگا۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

قرضِ حسنہ کے لئے اللہ کی پکار

آ گے فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسنہ؟'' یہاں للکارنے کا اور چیلنج کا انداز ہے کہ کون ہے وہ باہمت آدمی کہ جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟ یہ بالکل وہی انداز ہے جو سورۃ الاحزاب میں اختیار کیا گیا: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ فَمِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا﴾ (آیت ۲۳) ''مؤمنین میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا۔ ان میں سے کوئی تو اپنی ذمہ داری پوری کر چکا اور کوئی موقع کا انتظار کر رہا ہے اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی''۔ غالب کا یہ شعر درحقیقت اسی اسلوب میں ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق؟
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد!

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس اندازِ کلام سے کیا مراد ہے! اس آیت کے بین السطور درحقیقت یہی بات ہے کہ اللہ کے لئے جان و مال کا لگا دینا' کھپا دینا' آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے تو یقینِ کامل درکار ہے' وہ یقینِ کامل جس کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ جس نے وہاں سے کسب فیض کیا ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ آؤ یہ گوئے ہے اور یہ چوگان۔ یعنی let him prove his worth ــــ چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا معاملہ دیکھا کہ انہوں نے دو مرتبہ اپنا سب کچھ لا کر حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔ اوّل تو وہ مکّہ میں ہی اپنا تقریباً سارا سرمایہ ان غلاموں اور کنیزوں کے آزاد کرانے میں لگا چکے تھے جو ایمان لائے تھے۔ آپؓ نے انہیں آزاد کرانے میں ان کے آقاؤں کو مُنہ مانگی قیمتیں ادا کیں۔ اور جب حضور ﷺ کے ساتھ ہجرتِ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو اپنا بچا کچھا سارا مال ساتھ لے لیا اور اپنے اہل خانہ کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ آپؓ کے والد ابوقحافہ' جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور بعد میں ایمان لائے' بینائی سے محروم تھے' انہیں جب

© rasailojaraid.
©.rasailojaraid.

معلوم ہوا کہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تو چلے گئے ہیں تو اب وہ اپنی پوتیوں حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور پوچھا کہ وہ کچھ چھوڑ کر بھی گیا ہے یا نہیں؟ تو پوتیوں نے کپڑے میں کچھ کنکر اور پتھر باندھ کر کہا کہ دیکھئے دادا جان! یہ سونے اور چاندی کی ڈلیاں ہیں جو ابا جان ہمارے لئے چھوڑ کر گئے ہیں' حالانکہ وہ کنکریوں اور پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور پھر جب سن ۹ ھ میں غزوۂ تبوک کے لئے مال کے انفاق کا موقع آیا اُس وقت بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھر میں جھاڑو پھیر کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ یہ وہی موقع ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابوبکر کو جو مقام حاصل ہے وہ نمازوں اور روزوں کی وجہ سے نہیں' ان کا مقام اس شے کی وجہ سے ہے جو اُن کے دل میں ہے''۔ وہ درحقیقت یقین محکم تھا جو اُن کے دل میں تھا۔ اور یہ درحقیقت اللہ کی ذات اور اس کے وعدوں پر یقین ہی ہے جو انسان کو اپنا سب کچھ لگا دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ بصورت دیگر تو یہی ہوتا ہے کہ مال سینت سینت کر رکھے جاؤ' جائیدادیں بنائے جاؤ' اپنی اولاد کے لئے خوب مال و دولت چھوڑ کر مرو' البتہ ہر سال عمرہ ضرور کرتے چلو' حج پر حج کیے جاؤ اور اس کی گنتی بڑھاتے جاؤ۔ ہمارے ہاں تو نیکی کا تصور بس یہی رہ گیا ہے۔ اور وہ عمرے اور حج بھی ہو رہے ہیں حرام و حلال کی کمائی سے قطع نظر کہ وہ مال آیا کہاں سے ہے۔ یا پھر ہمارے ہاں نیکی کا تصور یہ رہ گیا ہے کہ کوئی لنگر کھول کر غریبوں کو کھلا دو' کہیں کوئی چندہ دے دو اور بس۔ جبکہ اصل محنت دنیا بنانے میں ہو رہی ہے۔ اپنا قیمتی وقت' اپنی جان' اپنی صلاحیتیں' اپنی ذہانت' یہ سب کچھ صرف ہو رہے ہیں صرف دنیا بنانے اور مال جمع کرنے میں۔

ان دو تصورات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایمان اگر دل میں جاگزیں ہوگا تو یہ تصور لائے گا کہ میرا سب کچھ خدا کا ہے' میں خود اسی کے لئے ہوں۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ''یقیناً میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا ربّ ہے''۔ انسان اپنے مال میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے جتنا جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہو'

© rasailojaraid
© rasailojaraid

اور یہ اپنے آپ کو برقرار رکھنا بھی اللہ کے دین کی جدوجہد کے لئے ہو۔ فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے''۔

ہمارے ہاں تو قرضِ حسنہ کا تصور یہ ہے کہ جو قرض دیا جائے بس صرف وہی واپس لینے کی امید ہو یا وعدہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ جس قرضِ حسنہ کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے گا۔ قرضِ حسنہ کے ضمن میں حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپؐ کبھی کسی سے قرض لیتے تھے تو واپس کرتے ہوئے رضا کارانہ طور پر اپنی طرف سے کچھ بڑھا کر دیتے تھے لیکن واپس کرتے ہوئے رضا کارانہ طور پر کچھ بڑھا دینا یہ ہدیہ کے درجہ کی شے ہے۔ اگر قرض میں پہلے سے کوئی اضافہ معین ہو تو وہ سود ہے اور حرامِ مطلق ہے۔ دین میں اس سے بڑی حرام چیز اور کوئی نہیں۔ عقائد میں شرک اور اعمال میں سود چوٹی کے گناہ ہیں۔ بہرحال اللہ کا قرضِ حسنہ کچھ اور ہے۔ جو شخص اللہ کو قرضِ حسنہ دے اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسے بڑھاتا اور دوگنا کرتا رہے گا۔ واضح رہے کہ یہ صرف دوگنا کرنا نہیں، بلکہ دوگنا کرتے رہنا ہے۔ یعنی جو مال تم نے دیا ہے وہ تو واپس ملے گا ہی، ساتھ اضافی طور پر بھی بہت کچھ ملے گا۔ جیسے سورۃ المزمل کے آخر میں فرمایا: ﴿تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَیْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا﴾ ''تم پاؤ گے وہ سب کچھ (جو کچھ تم نے دیا ہے) اللہ کے پاس بہت بہتر حالت میں، اور بہت بڑھا ہوا (فزوں تر)''۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ساتھ یہ بھی فرمایا: ﴿وَلَهٗ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝﴾ ''اور اس کے لئے بڑا باعزت (عزت افزائی کرنے والا) اجر ہے''۔ آیت ۷ میں ''اجرٌ کبیرٌ'' کے الفاظ آئے تھے، یہاں ''اجرٌ کریمٌ'' فرمایا۔ قرآن کریم میں اجر کے لئے ان دونوں dimensions کا ذکر ہوتا ہے کہ بہت بڑا اور باعزت اجر۔

میدانِ حشر کی تاریکیوں میں اہلِ ایمان کے نور کی کیفیت

اب اس سورۂ مبارکہ کا تیسرا حصہ شروع ہو رہا ہے جو چار آیات (آیت ۱۲ تا ۱۵) پر مشتمل ہے۔ جیسے پہلے حصے کی آیت: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ

© rasailojaraid.com

وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴾ فلسفے کی بلند ترین چوٹی پر ہے اور فلسفۂ وجود کے عقدے کو حل کر رہی ہے اسی طرح اس تیسرے حصے میں ایک آیت ہے جو نفاق کی حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ نفسیاتی سطح پر نفاق کے کیا مدارج اور مراحل ہیں؟ نفاق کہاں سے شروع ہوتا ہے' پھر اس کا دوسرا درجہ کیا ہے' تیسرا درجہ کیا ہے؟ نفسیاتی طور پر منافق کے اندر کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ وغیرہ۔ سورۃ المنافقون کے درس میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ نفاق کے تین درجے ہوتے ہیں' جیسے ٹی بی کے تین درجے (stages) ہوتے ہیں۔ نفاق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال اور جان کے کھپانے کا حکم آتا ہے تو ایسا شخص اس جہاد و قتال اور انفاقِ مال سے بچنے کے لئے جھوٹے بہانے شروع کر دیتا ہے۔ لیکن جب محض جھوٹے بہانوں کا اعتبار نہیں رہتا تو پھر جھوٹی قسمیں کھائی جاتی ہیں' یہ نفاق کا دوسرا درجہ ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اِتَّخَذُوْا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ ''انہوں نے اپنی (جھوٹی) قسموں کو ڈھال بنا لیا اور اللہ کے راستے سے رُکتے گئے!''۔ نفاق کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ جب سچے اہل ایمان اللہ کی راہ میں جان اور مال کی بازیاں لگا رہے ہوتے ہیں تو ان کے خلاف ان کے دلوں میں بغض اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ سچے اہل ایمان کو تو جب پکارا جاتا ہے تو وہ فوراً لبیک کہتے ہیں۔ بقول فیضؔ ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

تو جن اہل ایمان کی یہ روش ہوتی ہے وہ اب منافقین کے دلوں میں کھٹکنے لگتے ہیں' کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ہم نمایاں ہو رہے ہیں۔ ان کے خیال میں ان دیوانوں اور پاگلوں نے انہیں مصیبت میں ڈال رکھا ہوتا ہے۔ تو اب مؤمنین صادقین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ' جو اُن کے امیر ہیں' ان کی دشمنی شروع ہو جاتی ہے اور یہ نفاق کا تیسرا درجہ ہے۔

© rasailojaraid.com

یہ تین مدارج تو علامات ہیں جو عمل میں ظاہر ہوتی ہیں' لیکن ذہن میں اور نفسیات کے اندر جو کھچڑی پک رہی ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ اور یہ علامات درحقیقت کس اندرونی مرض کا ظہور ہیں؟ یہ اس سلسلۂ آیات کا مرکزی مضمون ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾ (آیت ۱۲)

''اس دن تم دیکھو گے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا' (اور ان سے کہا جائے گا) آج تمہیں ایسے باغوں کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے''۔

اب سچے اہل ایمان کے فوراً بعد منافقین کا تذکرہ آ رہا ہے۔ یہ قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب ہے کہ اہل جنت اور اہل جہنم کا تذکرہ simultaneous contrast کے طور پر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ فرمایا جا رہا ہے:

﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝﴾ (آیت ۱۳)

''اُس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے ذرا ہمیں مہلت دو اور ہمارا انتظار کرو' تاکہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کر سکیں' تو انہیں کہا جائے گا کہ پیچھے لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو' پھر اُن (اہل ایمان اور منافقین) کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا' اس کے اندر تو رحمت ہوگی اور باہر عذاب ہوگا''۔

قرآن مجید کے مختلف مقامات پر ہمیں میدانِ حشر کے مختلف نقشے ملتے ہیں اور مختلف مکالمات کا ذکر ہے۔ اس اعتبار سے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ میدانِ حشر کوئی ایک مرحلہ نہیں ہے' بلکہ اُس روز کے احوال مختلف مراحل سے گزر کر تکمیل تک پہنچیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرحلہ تو وہ ہے جہاں کافر اور مسلم جدا ہو جائیں گے۔ یعنی ایک

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

بڑی چھلنی لگے گی جس سے کھلم کھلا باغی و منکر اور مدعیٔ ایمان جدا جدا ہو جائیں گے۔ گویا کافر اِدھر اور مسلم اُدھر ہیں۔ لیکن اب دنیا میں جو قانونی اعتبار سے مسلمان سمجھے جاتے تھے ان میں مؤمنین صادقین بھی تھے اور منافقین بھی تھے۔ تو اب ایک اور چھلنی لگے گی جس سے گویا دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ یہ مرحلہ سورۃ الحدید کی ان آیات میں مذکور ہے۔ اس کے علاوہ یہی مضمون اس سلسلۂ سُوَر کی آخری سورۃ' سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔ وہاں ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ یُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ یَسْعٰى بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَ اغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے حضور خالص توبہ کرو' کچھ بعید نہیں کہ تمہارا ربّ تم سے تمہاری برائیاں دُور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ اس دن اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے' رسوا نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا۔ وہ کہیں گے اے ہمارے ربّ! ہمارے لئے ہمارا نور پورا کر دے اور ہمیں بخش دے' یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے''۔

تو ان دو مقامات پر یہ مضمون آیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب ہے کہ آپ کو اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور ملیں گے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا مرحلہ لازماً ہو گا جس میں مؤمنین صادقین کو منافقین سے جدا کر دیا جائے گا۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے جو شکل اختیار فرمائے گا وہ یہ ہے کہ جن کے دلوں میں ایمان موجود ہو گا ان کا نورِ ایمان ظاہر ہو جائے گا اور وہ ان کے سامنے کی طرف روشنی کرے گا۔ اور اس ایمان کے تحت جو اعمالِ صالحہ تھے' ان کا نور ان کے دائیں جانب ظاہر ہو گا' کیونکہ انسان کا دایاں ہاتھ اعمالِ صالحہ کا کاسب ہے۔ یوں سمجھئے کہ درحقیقت یہ ایمان ایک نور ہے۔ اس وقت تو نور قلب میں ہے' ہمیں نظر نہیں آ رہا ہے' جبکہ اس نور

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کی ایک اور صورت ہے جو وہاں ظاہر ہو گی۔ اسی طرح ہر نیکی کے اندر ایک نورانیت ہے اور یہ نور ہمیں یہاں نظر نہیں آ رہا، لیکن اس کی اصل ماہیت اور اصل حقیقت میدانِ حشر میں اس مرحلے پر واضح ہو جائے گی۔

میدانِ حشر میں ایک ایسا مرحلہ بھی ہے جسے ہماری زبان میں عام طور پر پل صراط کہا گیا ہے۔ یہ انتہائی گھپ اندھیرے میں جہنم کے اوپر بنا ہوا ایک راستہ ہے۔ سورۃ مریم میں اس کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ (آیت ۷۱) ''اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا اس (جہنم) پر گزر نہ ہو، یہ طے شدہ بات ہے جو تمہارے ربّ کے ذمہ ہے''۔ تو یہ پل صراط ہے جس پر سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔ یہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا انتہائی تنگ راستہ ہے جسے ہم اپنی استعاراتی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز راستہ ہے۔ اب جن کے پاس تو وہ نورِ ایمان اور نورِ اعمالِ صالحہ ہو گا وہ تو اس نور کی روشنی میں اس راستے کو دیکھ کر اس مرحلے سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے اور دوسرے جو اِس نور سے محروم ہوں گے وہ ٹھوکریں کھا کر جہنم کے اندر گریں گے۔ یہ ہے درحقیقت وہ چھلنی کہ جو میدانِ حشر میں کسی ایک مرحلے پر لگے گی۔

تو فرمایا: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ یہاں پر یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے کہ لفظ ''يَوْمَ'' یہاں منصوب کیوں ہے۔ اس بارے میں ایک رائے تو یہ ہے کہ اس سے ماقبل آیت کے آخر میں ''اَجْرٌ كَبِيْرٌ'' کا ذکر ہوا ہے، یہ اس کا ظرف ہے کہ وہ اجر کریم کب ظاہر ہو گا: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''(یہ اجر کریم ظاہر ہو گا) اُس دن کہ جب تو دیکھے گا مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا''۔ تو اس رائے کے مطابق یہ ظرفیت کا نصب ہے۔ اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ ''يَوْمَ'' سے پہلے ''اُذْكُرْ'' محذوف ہے کہ تصور کرو اس دن کا جس دن مؤمنوں پر یہ عنایت خاص ہو گی۔ اس رائے کے مطابق یہاں سے پھر استیناف ہو جائے گا، یعنی

© rasailojaraid.com

یہاں سے ایک علیحدہ کلام شروع ہو گا۔ میں اسی دوسری رائے کو زیادہ قوی سمجھتا ہوں' لیکن دونوں رائیں ممکن ہیں۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ ذرا تصور کرو اُس دن کا جس دن تم دیکھو گے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو کہ ان کا نور دوڑتا ہو گا ﴿بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ﴾ ''ان کے سامنے''۔ ان کے آگے آگے۔ یہ میرے نزدیک ایمان کا نور ہے جو قلب میں ہے' اس کی جو بھی روشنی پڑے گی وہ سامنے کی طرف ہو گی۔ ﴿وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''اور ان کے دائیں طرف''۔ سورۃ التحریم کی آیت ۸ میں بھی یہی الفاظ ہیں: ﴿يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ سورۃ التحریم میں تو ان کی دعا کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ جن کا نور تھوڑا ہو گا' وہ پھر دعا کریں گے: ﴿رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ کہ پروردگار! ہماری ان کوتاہیوں کو جن کی وجہ سے ہمارا یہ نور مدھم ہے' تو اپنے فضل و کرم سے معاف فرما کر ہمارے اس نور کا بھی اتمام فرما دے! گویا وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے پروردگار! جیسے تو نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کو نورِ کامل عطا فرمایا ہے ایسے ہی اپنے فضل و کرم سے ہمارے نور کا بھی اتمام فرما دے۔ اس لئے کہ حدیثِ نبویؐ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نور کے مختلف درجات ہوں گے۔ یہ گویا اس کا quantitative element ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت ابوبکر ؓ کے ایمان میں اور ایک عام آدمی کے ایمان میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ اور ہم سے کسی کو اگر کوئی رتی ماشہ ایمان نصیب ہو جائے تو اس کی کیا نسبت تناسب ہے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ایمان کے ساتھ! اس حوالے سے حضور ﷺ کے الفاظ ہیں کہ کچھ لوگوں کو تو جو نور ملے گا وہ اتنا ہو گا کہ اس کی روشنی مدینے سے صنعا تک پہنچے گی۔ (یہ یمن کا ایک شہر ہے۔) یعنی اس کے اثرات اس قدر زیادہ ہوں گے۔ اور فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو بس اتنا نور ملے گا کہ وہ صرف ان کے قدموں کے سامنے روشنی کر رہا ہو گا۔ لیکن یہاں نوٹ کر لیجئے کہ اُس وقت وہ نور بھی بہت غنیمت ہو گا۔ اس کا کسی قدر اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص گھپ اندھیری رات میں سفر کر رہا ہو اور وہ پگڈنڈی بھی واضح

© rasailojaraid.co

نہ ہو جس پر جانا ہے تو اس موقع پر اگر اس کو کوئی معمولی ٹارچ بھی مل جائے تو وہ اس کے لئے بڑی قیمتی چیز ہو گی' اور اگر کسی کے پاس لالٹین ہو تو وہ بھی ایسے موقع پر بڑا خوش نصیب ہو گا۔ جیسے اقبال نے کہا ہے ۔

اندھیری شب ہے' جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لئے ہے مرا شعلہ نوا قندیل!

لیکن اگر کسی کو حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما والا نور میسر آ جائے تو اس کے کیا کہنے۔ یہ فرق وتفاوت بہر حال ہو گا۔ حدیث نبویؐ میں یہ فرق وتفاوت اس حوالے سے بھی بیان ہوا ہے کہ چھوٹے اور کم تر درجے کا جنتی اپنے سے اوپر والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین پر بیٹھ کر آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہو۔ اس قدر فرق وتفاوت ہو گا!

آگے فرمایا: ﴿بُشۡرٰىكُمُ الۡيَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ ''(ان سے کہا جائے گا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لئے ان باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''۔ یعنی آج کا دن تمہارے لئے بشارت کا دن ہے۔ تمہاری کلفتوں اور مشقتوں کا دور اب ختم ہوا۔ تم امتحان کے مختلف مرحلوں سے گزر آئے ہو اور اب تمہاری سختیاں اور تمہاری ابتلاء وآزمائش ختم ہوئی۔ آج سے تمہارے لئے بشارت ہے ان باغات کی جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ میں عام طور پر ''تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ'' کا ترجمہ ''دامن میں ندیاں بہنا'' زیادہ پسند کرتا ہوں' اس لئے کہ باغ کا جو فطری تصور ہوتا ہے وہ یہی ہے۔ ایک باغ تو لوگوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے جو وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بناتے ہیں' جس کے مختلف levels ہوتے ہیں' جیسے کہ شالامار باغ ہے' جبکہ ایک باغ فطری ہوتا ہے۔ جیسے ایک وادی ہے' اس کے نشیب میں ایک ندی بہہ رہی ہے اور ندی کے دونوں اطراف میں ذرا بلندی پر درخت لگائے گئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ پانی کے اثرات زمین کے دونوں طرف سرایت کر رہے ہوں گے جو اُن درختوں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ لہٰذا ﴿تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ باغات کے دامن میں ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ علامہ اقبال نے اپنی

© rasailojaraid.com

نظم ''ایک آرزو'' میں اس کا ایک خوبصورت نقشہ کھینچا ہے ع پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو! بہر حال یہ کہنا کہ ''نیچے ندی بہہ رہی ہے'' یا یہ کہنا کہ ''دامن میں ندی بہہ رہی ہے'' اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

مزید فرمایا: ﴿خٰلِدِیْنَ فِیْھَا﴾ ''اس میں تمہیں رہنا ہے ہمیشہ ہمیش'' ﴿ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ ''یہی ہے اصل' بڑی کامیابی''۔ یہاں 'ذٰلِکَ' کے بعد 'ھُوَ' بھی آیا ہے اور یہ حصر کا اسلوب ہے کہ ''یہی ہے اصل بڑی کامیابی''۔ اس سے دراصل اس حقیقت کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ اگر چہ دنیا میں بھی انسان چاہتا ہے کہ اپنی محنت کے کوئی نتائج دیکھ لے' لیکن یہ اصل کامیابی نہیں ہے۔ جیسے سورۃ الصّف میں فرمایا گیا: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ﴾ کہ ایک اور وعدہ بھی تم سے کیا جا رہا ہے جو تمہیں بہت پسند ہے' اور وہ ہے اللہ کی طرف سے مدد اور فوری (دُنیوی) فتح۔ جبکہ اللہ نے تو یہ دنیا بنائی ہے صرف آزمائش کے لئے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ''اس نے تخلیق کیا ہے موت اور زندگی کو' تا کہ وہ تمہیں (اس کے ذریعے) آزمائے کہ کون ہے تم میں سے عمل کے اعتبار سے زیادہ بہتر''۔ تو جو اِس آزمائش میں کامیاب ہو گیا بس وہی ہے اصل میں کامیاب' چاہے دنیا میں ایسے شخص کی سعی و جہد کا کوئی نتیجہ برآمد ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ یہ دُنیوی کامیابی اس اعتبار سے بالکل غیر اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کئی جلیل القدر رسول دنیا سے یوں ہی چلے گئے کہ انہیں کوئی پیروکار نہیں مل سکے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ساڑھے نو سو (۹۵۰) برس کی تبلیغ کے نتیجے میں صرف ستر یا بہتر افراد ملے' بلکہ ایک رائے تو یہ بھی ہے کہ اتنے بھی نہیں ملے۔ سوائے ان کے تین بیٹوں اور ان کے گھر والوں کے کوئی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ قرآن کے الفاظ ہیں: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَہٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ﴾ (ھود: ۴۰) ''اور ایمان نہیں لائے اس کے ساتھ مگر تھوڑے ہی لوگ''۔ ساڑھے نو سو سال کا عرصہ بہت بڑا عرصہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ناکامی کا اس کوچے میں گزر ہی نہیں۔ جو آپؑ کا فرض تھا وہ انہوں نے بطریقِ احسن ادا کیا اور حجت تمام کر دی۔

© rasailojaraid.com

یہ نفسیاتی اعتبار سے بہت اہم مسئلہ ہے۔ خاص طور پر ہر اُس شخص کے لئے جو دین کی کسی خدمت کا بیڑا اٹھائے اور اس کے لئے کمر کس لے اس پر یہ بات پوری طرح واضح ہونی چاہئے کہ اس کا نصب العین سوائے آخرت کی فلاح اور اللہ کی رضا کے کوئی نہ ہو۔ کوئی اور شے اس کی نظر میں نصب العین کا درجہ اختیار نہ کر لے۔ اصل شے اپنے فرض کی ادائیگی ہے اور یہی اصل کامیابی ہے۔ چنانچہ سورۃ الصف میں فرمایا: ﴿تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ (آیت ۱۱) یعنی اگر تم یہ دو شرائط پوری کر لو کہ اللہ اور رسول (ﷺ) پر ایمان لے آؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو تو یہ چیز تمہارے لئے خیر ہے اگر تم جانو۔ اور وہ خیر کیا ہے! ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ ''وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور (تمہارے لئے) پاکیزہ مکانات ہوں گے رہائشی باغات میں۔ یہی ہے بڑی کامیابی''۔ آگے وہی بات کہی جا رہی ہے کہ ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ﴾ ''اور وہ دوسری چیز بھی (تمہیں عطا کرے گا) جو تمہیں بہت پسند ہے' اللہ کی طرف سے مدد اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح''۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ بات تو کہی جا رہی ہے سن ۶ ھ کے آس پاس۔ اس سے پہلے کتنے ہی صحابہؓ ہیں جو جامِ شہادت نوش کر چکے اور ابھی تو وہ نصرتِ خداوندی قریب بھی نہیں آئی تھی۔ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو مکے میں ہی شہید ہو گئے تھے جو اسلام کی مغلوبیت کا دور ہے۔ یوں کہئے کہ اسلام ابھی اپنی اجنبیت کے دور میں تھا۔ تو ذرا سوچئے کہ جو مکہ میں ہی شہید ہو گئے' کیا وہ ناکام ہیں؟ (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ) لہٰذا یہ بات ذہن میں بالکل واضح رہنی چاہئے۔ ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آدمی جب دیکھتا ہے کہ اس دنیا میں میری کوشش بارآور نہیں ہو رہی اور لوگوں کا رجوع میری طرف نہیں ہو رہا' لوگ میرا ساتھ نہیں دے رہے تو وہ

© rasailojaraid.com

by hook or by crook کے مصداق کوئی الٹا سیدھا طریقہ آزماتا ہے اور کوئی مختصر اور آسان راستہ (شارٹ کٹ) اختیار کر لیتا ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ہوتا ہے اگر ذہن میں یہ خناس پیدا ہو جائے کہ اصل کامیابی تو یہاں کی کامیابی ہے۔ جبکہ یہ بات ہرگز نہیں ہے' بلکہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴾ ''یہی ہے اصل بڑی کامیابی''۔

حصولِ نور کے لئے منافقین کی دہائی اور اس کا جواب

آگے ترجمہ کر لیجئے: ﴿يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا ﴾ ''اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ اہل ایمان سے کہیں گے کہ ذرا ہمارا انتظار کرو!'' اب ذرا اس کو چشمِ تصور سے دیکھئے کہ جنہیں وہ نورِ ایمان اور نورِ اعمال صالحہ مل گیا وہ خوشی خوشی راستہ طے کر رہے ہیں اور جن کے پاس یہ نور نہیں ہے وہ انہیں باحسرت و یاس پکار رہے ہیں کہ ذرا ہماری حالت پر نظر کرو! ذرا ہمارا انتظار کرو! نَظَرَ ' يَنْظُرُ دیکھنے کے معنی میں آتا ہے اور اسی سے باب افتعال کا مصدر ''انتظار'' آتا ہے۔ انتظار کے معنی تو بالکل معین ہیں کہ کسی کا انتظار کرنا' کسی کی راہ دیکھنا' کسی کو ذرا مہلت دینا۔ تو ''اُنْظُرُوْنَا'' یہاں اسی معنی میں ہے کہ ذرا ہمیں مہلت دیجئے' ہمارا انتظار کیجئے! ﴿نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ﴾ ''تاکہ ہم آپ کے نور سے اقتباس کر لیں۔'' آپ کے نور سے ہم بھی کچھ فائدہ اٹھالیں' کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ یعنی ہم خود تو تہی دست ہیں' ہمیں نور نہیں ملا' آپ ذرا ہم پر عنایت کریں! یہ اقتباس کا لفظ بھی قَبَسَ سے باب افتعال کا مصدر ہے۔ قَبَسٌ کہتے ہیں چنگاری کو۔ آپ کسی کے چولہے سے چنگاری لے آئے اور اپنے چولہے میں آگ جلالی تو یہ اقتباس ہے۔ اردو میں ہم یہ لفظ quotation کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ آپ اپنا کوئی مضمون لکھ رہے ہیں اور اس میں آپ نے کسی اور کے مضمون سے کوئی شے لا کر شامل کی تو یہ اقتباس ہے۔ گویا آپ نے کسی کے چولہے سے ایک چنگاری لا کر اپنے چولہے میں شامل کی۔ البتہ اس کی آپ نشان دہی بھی کر دیتے ہیں کہ یہ quotation ہے جو

© rasailojaraid
© rasailojaraid

فلاں کے مضمون سے لی گئی ہے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کو دورانِ سفر راستے میں جب آگ نظر آئی تھی تو انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات سے کہا تھا: ﴿امْكُثُوا اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی﴾ ''ٹھہرو، مجھے آگ نظر آئی ہے، شاید میں وہاں سے آپ کے لئے کوئی انگارا لاسکوں یا مجھے اس آگ پر سے راستے کا ہی کچھ پتہ چل جائے''۔ تو یہاں منافقین کے قول میں بھی وہی لفظ آیا ہے: ﴿اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ کہ ذرا ہمیں مہلت دو، ہمارا انتظار کرو، ہمارے لئے ٹھہرو، کہاں قدم بڑھائے چلے جارہے ہو، ذرا ٹھہرو کہ ہم تمہارے اس نور سے استفادہ کرلیں، تاکہ ہم بھی کسی طور سے اس کٹھن منزل کو طے کرلیں۔

© rasailojaraid.com

﴿قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا﴾ ''(تو ان سے) کہا جائے گا کہ (اگر ممکن ہے تو) اپنے پیچھے (واپس) چلے جاؤ، پھر (وہاں) نور تلاش کرو''۔ یہاں ذرا نوٹ کیجئے کہ لفظ ''قَالُوْا'' کے بجائے ''قِیْلَ'' آیا ہے۔ یعنی ان سے کہا جائے گا۔ اب جبکہ اس بُرے حال میں وہ اِن مؤمنین سے درخواست کریں گے تو اِن اہل ایمان کی مروّت، شرافت اور نجابت سے یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ انہیں جھٹک دیں اور ترشح کر کہیں کہ جاؤ واپس دنیا میں جا کر نور تلاش کرو۔ لہٰذا مجہول کا صیغہ آیا ہے کہ ان سے کہا جائے گا۔ (قِیْلَ) کوئی کہے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ جیسے بشارتیں دینے والے ہاتف غیبی ہوں گے، کوئی ملائکہ ہوں گے، اسی طرح ان کو غیب سے کہا جائے گا کہ لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور تلاش کرو نور۔ لمس کہتے ہیں چھونے کو، تو التماس کا مطلب ہے کسی شے کو تلاش کرنا، ٹٹولنا، حاصل کرنا۔ ان الفاظ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ یہ نور یہاں سے نہیں ملتا، یہ دنیا میں حاصل کیا گیا تھا، یہاں تو بس ظاہر ہوا ہے۔ اہل ایمان نے دنیا میں ہی یہ نور کمایا تھا اور انہوں نے قرآن سے اقتباسِ نور کیا تھا۔ قرآن تمہارے پاس بھی تھا لیکن تم جان بوجھ کر اس سے محروم رہے، اور یہ اعمالِ صالحہ کا نور بھی یہ دنیا سے کما کر لائے ہیں جو یہاں ظاہر ہو رہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ دنیا میں واپس لوٹ کر جانے کا کوئی امکان نہیں، اب دنیا کی طرف رُجوع کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا ﴿ارْجِعُوْا

© rasailojaraid.com

وَرَآءَ کُمُ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ﴾ کا ترجمہ ہم کریں گے کہ اگر ممکن ہے تو لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف (دنیا میں) اور حاصل کرنے کی کوشش کرو نور کو!

اہل ایمان اور منافقین کی تقطیب

آگے فرمایا: ﴿فَضُرِبَ بَیۡنَہُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌ ﴾ ''پس ان (اہل ایمان اور منافقین) کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا''۔ یعنی یہی مکالمہ ہو رہا ہوگا' یہی گفتگو ہو رہی ہوگی کہ ایک فصیل ان کے مابین حائل کر دی جائے گی۔ یعنی اہل ایمان آگے نکل جائیں گے اور جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ان کے اور منافقین کے مابین دیوار حائل کر دی جائے گی۔ آگے اس در و دیوار کی کیفیت بیان کی جا رہی ہے کہ ﴿بَاطِنُہٗ فِیۡہِ الرَّحۡمَۃُ﴾ ''اس کے اندر رحمت ہوگی''۔ اس کے اندر کی طرف رحمت خداوندی کا نزول شروع ہو جائے گا' اہل ایمان کی ابتدائی مہمان نوازی کا آغاز ہو جائے گا' استقبالیہ شروع ہو جائے گا ﴿وَظَاہِرُہٗ مِنۡ قِبَلِہِ الۡعَذَابُ ﴾ ''اور اس کے باہر عذاب ہوگا''۔ اس فصیل کے باہر کی طرف' اس کے سامنے کی طرف عذاب کا آغاز ہو جائے گا۔ اس درس کا تسلسل ان شاء اللہ اگلی نشست میں جاری رہے گا۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم

(ترتیب وتسوید: طارق اسماعیل ملک)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

© rasailojaraid.c